© rasailojaraid.com

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

اے آبِ رودِ گنگا

ایک جائزہ

رفیق ڈوگر ملک کے معروف صحافیوں اور اہل قلم میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ سیاسی اور معاشرتی مسائل پر دھڑلے سے لکھتے ہیں۔ ۱۹۸۱ میں انھیں زائرینِ درگاہِ حضرت نظام الدین اولیا کے ہمراہ بھارت جانے کا اتفاق ہوا۔ اس چند روزہ قیام میں انھوں نے وہاں جو کچھ دیکھا، جو کچھ محسوس کیا اور جو کچھ انھیں درپیش آیا، اسے انھوں نے "اے آبِ رودِ گنگا" کے عنوان سے کتابی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ یہ کتاب بظاہر ایک سفرنامہ ہے، لیکن اس میں ایک سچے محب وطن کے پُرخلوص جذبات، ایک مزاح نگار کا بھرپور طنز و مزاح اور اس کی اپنی تاریخ پر نظر اور اس تاریخ سے شیفتگی کا اظہار بدرجۂ اتم موجود ہے۔ فاضل مصنف نے انداز ایسا اختیار کیا ہے کہ قاری کو کسی قسم کے روکھے پن یا مشکل پسندی کا احساس نہیں ہوتا۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے یہاں سے جب کوئی خاص فن کار، ادیب یا شاعر باہر جاتا ہے تو وہاں اپنی آؤ بھگت سے متاثر ہو کر اپنے نظریات اور اپنی نظریاتی مملکت وغیرہ کے بارے میں ایسی باتیں کہنے سے بھی گریز نہیں کرتا، جسے ہم وطن دوستی کے سلسلے میں منافقت کا نام دے سکتے ہیں۔ "اے آبِ رودِ گنگا" میں کہیں بھی ایسی منافقت نظر نہیں آتی۔ مصنف کو جب بھی اپنے وطن کی بات یا وطن کی وکالت کرنے کا موقع ملتا ہے وہ برملا اور کھل کر بات کرتا ہے اور وہی بات کہتا ہے جسے حق سمجھتا ہے۔ بھارت کے ایک اسٹیشن پر جب گاڑی کی کھڑکی کے قریب ایک بھارتی شہری ایک پاکستانی زائر سے پرانے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ "یہ تو جی سیاست کی دیواریں ہیں ورنہ ہم سب ایک ہیں۔ ہمارے آبا و اجداد صدیوں اکٹھے رہے ہیں۔ یہ دیواریں زیادہ عرصے تک ہمیں ایک دوسرے سے دور نہیں رکھ سکتیں" تو مصنف زائر کی زبان سے اس کا منہ توڑ جواب دیتا ہے: "بالکل نہیں جی۔ میں اس شہر میں اپنے عزیزوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی جو پندرہ لاشیں چھوڑ گیا تھا انھیں واپس لینے کے لیے مجھے یہ دیواریں پھلانگنا پڑیں گی۔ (ص ۵۸-۵۹)

دلی کے ایک بازار میں مصنف کی ملاقات ایک "شکست خوردہ" برہمن سے ہوتی ہے۔ یہ برہمن مصنف کو ایک برہمن زادہ قرار دیتا اور اپنے اس قول پر مصر رہتا ہے۔ مصنف کھل کر اُسے بتاتا ہے کہ "میں مسلمان ہوں، آپ بھی یہ جانتے اور پہچانتے ہیں۔" برہمن اپنی اس رٹ اور ہٹ سے ہٹنے کی بجائے نئے پہلو سے وار کرتا ہے۔ "آپ ہندی نژاد ہیں۔ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ آپ کا رنگ، لباس اور زبان اس کا ثبوت ہیں۔" مصنف بغیر کسی معذرت کے اس وار کا توڑ الفاظ کے ان تیز اور چمکیلے ہتھیاروں سے کرتا ہے۔ "آپ کو رنگ، لباس اور زبان سے غلط فہمی ہوئی ہے، میں صرف مسلمان ہوں۔ ہم انسانوں کو ان کے لبادوں، رنگوں اور بولیوں کے حوالے سے نہیں، ان کے مقصدِ حیات کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔" (۶۱)

مصنف کی حب الوطنی، ملت پرستی اور اپنے تابناک ماضی سے لگاؤ کی عکاسی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ وہ اپنے شاندار ماضی کا ذکر فخر اور درد و غم کے ملے جلے جذبات سے کرتا ہے۔ وہ اسی برصغیر کی پیداوار ہونے کے سبب اس کی تاریخ سے گہری واقفیت رکھتا ہے اور ہر ہر موقع پر اس کا اظہار کرتا ہے۔ بھارت سے زائرین کا واپسی سفر شروع ہو چکا اور مصنف گاڑی میں بیٹھ چکا ہے۔ گاڑی روانہ ہوتی ہے تو وہ اپنے ماضی میں کھو جاتا ہے۔ اس کا ذہن اسے بہت دور لے جاتا ہے۔

"گاڑی آہستہ ہو تو دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی ہیں۔ گاڑی کی رفتار میں زیادتی کے ساتھ ساتھ یہ دھڑکنیں مدھم پڑنے لگتی ہیں۔ گاڑی آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز تیز تھیں۔ اس لیے نہیں کہ ہمارے پیارے ہم سے جدا ہو رہے تھے۔ ہنستے بستے دلی پلیٹ فارم پر ہمارا کوئی بھی نہیں تھا، ہمارے اپنے ماضی کے سوا، جو ایک طرف کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ وہ کچھ دور تک گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑتا رہا اور پھر پیچھے رہ گیا۔ برق رفتار ٹرین ہمیں اپنے ساتھ شاندار ماضی سے دُور اور دُور لیے جا رہی تھی۔ افراد اور اقوام کا ماضی ان کا سب سے قیمتی اثاثہ ہوتا ہے۔ یہ سرمایہ غیروں کے قبضے میں ہو تو جدائی کا صدمہ اور بھی ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ (ص ۲۹۱)

مسجد قوت الاسلام کے پاس ہندو خاتون گائیڈ یورپی سیاحوں کو مسلمانوں کے مظالم کی داستانیں سنانے اور یہ باور کرانے میں مصروف ہے کہ یہ مسجد اب بھی ایک مندر ہی ہے مسجد نہیں۔ مصنف اس کی اس حرکت پر تڑپ اٹھتا ہے۔ اس کے پاس وقت نہیں کہ وہ اس عورت کی اس کذب بیانی کا توڑ کر سکے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ وہاں اس کی کیفیت ''مردہ بدست زندہ'' کی سی ہے، تاہم اپنے دل کا درد وہ صفحۂ قرطاس پر یوں بکھیر دیتا ہے:

اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں اس کے بعد سیاحوں کو در و دیوار اور محرابوں پر کندہ آیاتِ قرآنی بھی دکھاتا، انھیں سمجھاتا کہ قرآن دراصل دلّی میں نازل ہوا تھا کہ ان کے مندروں کے در و دیوار پہ اس کی آیات بھی تو کندہ ہیں۔ (ص ۲۶۹)

جیسا کہ پہلے عرض ہوا، مصنف کسی موقع پر اپنے تاریخی شعور کے اظہار سے غفلت نہیں برتتا۔ چناں چہ پاکستان سے روانگی کے وقت ہی وہ اس طرف آجاتا اور اس باب کا عنوان ''تاریخ کے نقشِ قدم'' پر رکھتا ہے۔ ابھی وہ اپنے ہی شہر سے بس میں گزر رہا ہے کہ شاہی مسجد کے قریب رنجیت سنگھ کی مڑھی دیکھ کر مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم کی داستانوں میں کھو جاتا ہے۔ ان داستانوں کو وہ رمزو ایمائیت کے پیرائے اور بڑے ہی مختصر انداز میں کہہ جاتا ہے۔

ہمارے قومی سفر میں قلعوں، مسجدوں، میناروں کے درمیان میں کہیں نہ کہیں رنجیت سنگھ اور ان کی مڑھیاں ضرور آتی ہیں۔ رنجیت سنگھ ہماری تاریخ کا حصہ ہیں، تاریخی حقیقت ہیں۔ جو مسافر راستے کے اتنے بڑے اور اہم حقائق سے بھی بے پروا ہوں، ان کا منزل آشنا ہو جانا تاریخ کے معجزوں میں شمار ہوتا ہے۔ (ص ۱۲-۱۳)

جہاں گیر نے نور جہاں کو حاصل کرنے کے لیے اس کے شوہر شیر افگن کو مروا ڈالا۔ بعد میں نور جہاں اس پر پوری طرح چھائی رہی، لیکن اس کے باوصف جہاں گیر عدل کے معاملے میں اس کے اثر سے باہر رہا۔ مصنف جب قلعۂ لاہور کے قریب سے گزرتا ہے تو تاریخ کے یہ اوراق اس کے سامنے کھلنے لگتے ہیں، اور وہ نور جہاں اور جہاں گیر کے اس واقعے کو یوں بیان کرتا ہے:

شہنشاہِ ہند جس کے ہاتھ میں میزانِ عدل اور کندھے پر ملکۂ ہند کا دستِ مبارک دھرے رہتے تھے، کہتے ہیں ملکۂ معظمہ کے ہاتھ کا وزن کبھی بھی میزانِ عدل میں محسوس نہیں کیا گیا۔ شہنشاہِ معظم یہ سارا وزن اپنے شاہی کندھوں پر برداشت کرتے تھے۔ (ص ۱۳)

مصنف کا قافلہ دلی کے قریب پہنچنے والا ہے۔ اس موقع پر اسے برصغیر پر نادر شاہ کے حملے کے وقت مغلیہ بادشاہ کا یہ تاریخی جملہ ذہن میں آجاتا ہے ''ہنوز دلّی دور است'' اور پھر وہ موقع کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطابق منظر کشی کرتا ہوا اپنی تاریخ کے دھاروں میں بہہ جاتا ہے :

دِلّی ! میرے خوابوں کا شہر، واقعی دلی قریب آرہا ہے ؟ خواب حقیقت بن جائیں تو بھی یقین نہیں آیا کرتا ۔ کیا قافلہ ہائے شوق انہی راستوں سے گزرے تھے ! یہ راہیں، یہ درخت، یہ مٹی اور یہ ٹیلے کتنے رازوں کے امین ہیں ؟ کتنے معرکوں، حادثوں اور المیوں کے عینی شاہد ہیں ۔ (ص ۶۰)

مقبرہ ہمایوں پر جب کوئی واقفِ حال اسے احتیاط سے اس جگہ پاؤں رکھنے کو کہتا ہے کہ وہاں ہزاروں مسلمانوں کے جسم و روح مقیم ہیں، کیوں کہ ۱۹۴۷ میں ہزاروں مسلمان جانیں بچانے کے لیے وہاں آکر پناہ گزیں ہوئے تھے، لیکن جانیں پھر بھی نہ بچا سکے، تو اس کا تاریخی شعور بیدار ہوجاتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے :

ہم نے کیا کہا انھیں معلوم نہ تھا کہ اس مقبرے نے تو بہادر شاہ ظفر کو بھی پناہ نہیں دی تھی، انھیں کیا پناہ دے گا ۔ کسی قوم کی تاریخ کے کھنڈر اسے پناہ دے سکیں یا نہ دے سکیں، قومیں مصیبت کے وقت رُخ انہی کھنڈروں کا کرتی ہیں ۔ (ص ۷۶)

اسی طرح حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر پہنچ کر جب وہ مختلف شاہان برصغیر پاک و ہند کے مزار اور ان کے کتبوں کو دیکھتا ہے تو مغلیہ دور کے بہت سے شہزادوں اور شہزادیوں کا ایک ایک کتبہ اس کی نظروں کے سامنے سے گزرتا ہے، پھر وہ کتبِ تاریخ کے حوالے سے اورنگ زیب عالم گیر، جہاں آرا، محمد اکبر شاہ ثانی کے فرزند میرزا جہاں گیر وغیرہ کے دو ایک واقعات مختصراً بیان کر جاتا ہے ۔ "دھوپ اور سائے" کا سارا باب ایسے ہی تاریخی واقعات و حوالہ جات سے پُر ہے ۔ باب "قلعۂ معلیٰ پر حملہ" میں بھی مصنف مغلیہ دور کے بعض شان دار اور بعض عبرت ناک واقعات میں کھویا ہوا نظر آتا ہے ۔ غرض جہاں بھی اسے موقع ملا ہے اس نے سیاق و سباق کے مطابق اپنی تاریخ سے اپنی وابستگی و آگاہی کا اظہار کیا ہے ۔

ذکر حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور ان کے مریدِ خاص حضرت امیر خسرو کا ہو رہا ہے ۔ مصنف خسرو کے شاہی دربار اور اپنے مرشد سے تعلقات کے بارے میں پوری طرح باخبر ہے ۔ چنانچہ وہ ان تعلقات کا ذکر کر کے ایک جگہ کہتا ہے :

خسرو دربارِ شاہی میں اونچی مسند پر بیٹھتا اور دربارِ اولیا میں نیچی زمین پر ۔ نیچی زمین نے اسے ہمیشہ کے لیے بلند کر دیا ۔ (ص ۸۳)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میرزا جہاں گیر نے ایک انگریز ریذیڈنٹ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ مصنف اس کے لیے بڑی عزت و تعظیم کا اظہار کرتا ہے، پھر یہ کہتے ہوئے کہ "تیموری خاندان میں پھر کوئی اتنا باغیرت شہزادہ کبھی پیدا نہ ہو سکا" اس کا سبب یہ بتاتا ہے :

"سنہری ایوانوں اور روپہلی دیوانوں میں غیرت زنگ آلود ہو جاتی ہے۔ (ص ۸۶)

انگریزوں کے دور میں جامع مسجد دلّی کے ساتھ جو سلوک ہوا، مصنف نے بڑے کرب کے ساتھ اس کی کسی قدر تفصیل دی ہے، لیکن پھر صرف ایک جملے میں پوری تاریخ بیان کر دی ہے۔ اس جملے سے مصنف کی مذہب سے وابستگی کا بھی پتا چلتا ہے :

" قلعہ والے مِٹ گئے مسجد والے آج بھی زندہ ہیں " (ص ۱۰۷)

قلعۂ معلّیٰ کی سیر کرتے ہوئے مصنف کو عرب طلبا اور طالبات کا ایک گروہ نظر آتا ہے۔ ان طلبا کے سر پر پیسے اور فیشن کا بھوت بُری طرح سوار ہے۔ اس کا نقشہ ملاحظہ ہو :

" ہمارے پڑوس میں عرب طلبا اور طالبات کا ایک گروہ اپنے مالی اور جانی خزینوں اور دفینوں کا مظاہرہ کرنے میں بُری طرح مصروف تھا۔ وہ سب اپنے اپنے کاغذی پیرہن کے جملہ بٹن کھول کھول کر بھارت کی ثقافتی بالادستی کا وِرد کر رہے تھے۔ اکثر مال دار لوگ احساسِ زیاں سے تہی دست ہوتے ہیں، وہ مال دار ہی نہیں سیاح بھی تھے اور ایک مکتبِ فکر کے مطابق سیاح کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے نہ قوم ۔ (ص ۱۴۷)

قلعہ کے دیوانِ عام کی بات ہو رہی ہے جہاں کبھی شہنشاہوں کے وکیل بھی سر جھکا کر پاؤں رکھا کرتے تھے۔ مصنف سر جھکائے بغیر اس کی تمام سیڑھیاں چڑھ جاتا ہے۔ اسے خیال آتا ہے کہ اگر آج بھی کوئی شہنشاہ اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا اور امرا و وزرا دست بستہ کھڑے ہوتے تو وہ شاید ایک بھی سیڑھی اس طرح نہیں چڑھ سکتا تھا، اور پھر یہی خیال اس سے یہ بات کہلواتا ہے:

جو بندۂ خدا اپنے جیسے بندوں کے سر اپنے سامنے جھکے ہوئے دیکھنا پسند کرے، اس کا نہیں تو اس کی نسل کا سر لازماً کسی دوسرے کے آگے جھک جاتا ہے۔ بادشاہوں اور شہنشاہوں کی عالمی تاریخ کے ہر صفحے پر یہ بات لکھی ہے، معلوم نہیں بادشاہوں اور شہنشاہوں کو یہ تحریر نظر اور سمجھ کیوں نہ آ سکی۔ (ص ۱۴۸، ۱۴۹)

مغل بادشاہ اپنے قلعوں اور مقبروں کے ساتھ ساتھ ایک ایک کارواں سرائے بھی بنایا کرتے تھے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس میں مسافروں اور غربا و مساکین کے لیے قیام و طعام کا بندوبست ہوتا تھا - مصنف تاج محل کے ساتھ بنائی گئی ایک ایسی ہی سرائے دیکھ کر سوچنے لگتا ہے :

"سرائے سے ہو کر مقبرے میں جانا، اس بات کی یاد دہانی کے لیے تو نہیں کہ یہ دنیا ایک سرائے ہے جو کوئی اپنا مال، تجارت کے لیے لے کر آتا ہے، اس میں چند روز قیام کر سکتا ہے - اس کے بعد اسے دوسرے دروازے سے اگلی منزل کے لیے روانہ ہونا ہوتا ہے، اس دنیا کی طرف جس میں وہی کام آئے گا جو غربا و مساکین پر خرچ کیا ہو گا - (ص ۲۲۷)

وطن واپس ہوتے ہوئے راستے میں مصنف اپنے شاندار اور تابناک ماضی کی یاد میں کھو جاتا ہے اور ایسے میں حضرتِ علامہ کا یہ شعر

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

اس کے احساسات و جذبات کو اس طرح متاثر کرتا ہے :

اقبال کا یہ شعر مجھے اس روز سمجھ میں آیا - گاڑی اسی رفتار سے دوڑ رہی تھی - میں جتنی بار یہ شعر پڑھتا آسمان کے چاند کی روشنی زمین پر اتنی ہی شدید ہو جاتی - یہ شعر لکھ کر اقبال نے زمین سے رشتہ توڑ کر چاند اور اس کی روشنی سے قائم کر لیا تھا - (ص ۲۹۴)

مصنف زائرین کے ہمراہ لاہور سے روانہ ہو رہا ہے - راستے میں شاہی مسجد کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے یاد آتا ہے کہ کبھی یہ جگہ دریائے راوی کی گزرگاہ تھی، اور یہی یاد اسے ایک اور یاد میں محو کر دیتی ہے -

کہتے ہیں کہ جب پاکستان بنا تو دلّی کے ہونٹ خشک ہونے لگے تھے - اس کے ہونٹوں کی سرخی شدتِ غم میں زرد پڑ گئی - اس نے پاکستان کے حامیوں کے خون سے ہونٹ سُرخ کیے تو خون آشام دلی کے منہ کو خون لگ گیا - جب لاکھوں انسانوں کے خون سے بھی اس کی پیاس نہ بجھی تو وہ پاکستان کی طرف بہنے والے دریاؤں کا پانی بھی پی گئی - (ص ۱۳، ۱۴)

ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارتی افواج نے بغیر اعلانِ جنگ کے پاکستان پر حملہ کر دیا اور لاہور کے قریب واہگہ چیک پوسٹ اور چند ایک گاؤں پر قبضہ کر لیا تھا - جنگ بندی کے اعلان کے بعد جب بھارتی افواج ان علاقوں سے واپس گئی تو یہ علاقے اس کی بربریت کا کھلا ثبوت پیش کر رہے تھے - رفیق ڈوگر کا قافلہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب واگہہ کی طرف بڑھتا ہے تو اسے یہ واقعات یاد آجاتے ہیں اور وہ اس کی تصویر کشی شروع کر دیتا ہے:

ان سڑکوں، راستوں اور کھیتوں میں ہمارے عظیم دوست بھارت کے ٹینک اور توپیں پیامِ دوستی گھر گھر پہنچانے کے لیے دوڑتے اور دھاڑتے پھر رہے تھے۔ پھر جب کئی ماہ تک ہمارے مہمان رہ کر وہ اپنے گھروں کو واپس گئے تو اس زمین کی ہر چیز اپنے ساتھ لے گئے، مکانوں کی چھتیں، کھڑکیاں، دروازے، اینٹیں، سڑکوں کے کنارے سے درخت اور کھیتوں سے ہریالی۔ وہ اس خطۂ زمین پر لوہے اور بارود کی توانا فصل چھوڑ گئے، جس کو کاٹتے ہوئے سینکڑوں بچے، جوان اور بوڑھے بھارت کے جذبۂ دوستی کی نذر ہو گئے تھے۔ (ص ۱۶)

ڈوگر کی طبیعت میں شگفتگی و مزاح بھی ہے اور طنز کی کاٹ بھی۔ واگہہ پر کرنسی کا کاروبار کرنے والے ہندو، پاکستانی زائرین سے روپیہ خریدنا چاہتے ہیں لیکن یہ اعلان بھی کرتے جاتے ہیں کہ پاکستانی روپیہ یہاں کون لیتا ہے اور روپیہ سمیٹتے بھی جاتے ہیں۔ مصنف ان کا یہ اعلان کئی مرتبہ سنتا ہے۔ آخر مجبور ہو کر کہتا ہے:

پاکستانی روپیہ کوئی نہیں لیتا تو آپ نے کیا داج میں دینا ہے؟ (ص ۲۵)

ایک موقع پر ایک ذمہ دار سکھ افسر سے پاک پنجاب اور بھارتی پنجاب میں پنجابی زبان کی اشاعت و ترقی سے متعلق بات چیت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں مصنف بھارتی پنجاب میں بھی گورمکھی رسم الخط کی بجائے نستعلیق کی ترویج کی تجویز پیش کرتا ہے، جس پر مذکورہ سکھ گورمکھی کا مطلب "گوروؤں کے منہ سے نکلی ہوئی" بتاتا ہے، دوسرے لفظوں میں اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ مصنف فوراً اس کا توڑ اس شگفتہ جملے سے کرتا ہے:

"گورو کے منہ سے رسم الخط تو نہیں نکلا ہوگا" (ص ۵۱)

ایک بوڑھا ہندو بھارتی قلی، جس کا کبھی لاہور سے تعلق تھا، جب مصنف سے لاہور کے بارے میں کچھ پوچھتا اور یہ کہتا ہے کہ "میں بھی لاہور کا رہنے والا ہوں" تو مصنف اسی لمحے اس کے اس تعلق پر اپنا شگفتہ ردِ عمل ظاہر کرتا ہے:

"یہاں پاسپورٹ پر مزدوری کرنے آئے ہو؟" (ص ۲۳)

طنز و مزاح کے چٹکلے میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے موجودہ گدی نشین کی تصویر بھی ملاحظہ ہو:

امام ضامن سیدھے سادے سجادہ نشین ہیں۔ ان میں خواجہ حسن نظامی کی سی بزرگی ہے نہ خواجگی۔ انھیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زائرین کو حضرت نظام الدین اولیا ہی کی کرامات سے نوازنا پڑتا ہے ۔ کس بادشاہ نے کیا گستاخی کی اور اس کا کیا انجام ہوا - ان گستاخیوں اور عبرت ناک انجاموں کا علمی ذخیرہ کافی وسیع رکھتے ہیں، لیکن انھیں استعمال کرنے کی مہارت نہیں رکھتے - بات الٹنا بھی چاہیں تو زیادہ گہری الٹنی نہیں لگا سکتے ۔ (ص ۸۹)

رفیق ڈوگر ایک صحافی ہے اور نثر نویس ہے، لیکن "اے آب رود گنگا" میں اس کے بعض خوب صورت جملے شاعرانہ رنگ لیے ہوئے ہیں ۔ جگہ جگہ اس نے فارسی اور اردو اشعار اور مصرعے کھپا کر جہاں عبارت میں زور پیدا کیا ہے وہاں اپنی شعر دوستی اور شعری ذوق کا بھی مظاہرہ کیا ہے ۔ خاص طور پر جن بعض جملوں میں اس نے کسی مشہور شعر کا کوئی ٹکڑا چسپاں کیا ہے ان میں ایک خاص دلکشی اور تاثیر پیدا ہو گئی ہے ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

"اس کے طالع بیدار نے اسے رات بھر سونے نہیں دیا" (ص ۵۷)

(یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا ‌‌ ‌ رات بھر طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا)

"ہم نے شیو کا سامان نکالا اور مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ..." الخ (ص ۸۵)

حضرت اقبال کے اس شعر سے ماخوذ ہے :

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

"اپنی جبین نیاز میں سجدے کی تڑپ کا احساس نہ ہوا" (ص ۱۱۳)

حضرت علامہ فرماتے ہیں :

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

"دلی وہ چمن ہے جس میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری" (ص ۱۹۳)

حضرت علامہ کا شعر ہے :

اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

"وہ بنگالی بھی گالی سن کر بدمزہ نہیں ہوتے ۔" (ص ۲۱۰)

غالب کہتا ہے :

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

© rasailojaraid.com